ڈاکٹر عابد حسین سیال*

سر سید کی تحریک اور نئی ادبی جمالیات

Abstract: *Sir Syed Ahmed Khan is one of the most prominent and influential Muslim personalities of nineteenth century in the Indian subcontinent. His contribution is multi-dimensional ranging from practical efforts in the field of education and socio-political awareness to theoretical views in religion and literature. Focusing on his literary standpoints as well as his literary companions' writings we can significantly feel a paradigm shift with regards to literary aesthetics as compared to former literary tradition. Reason, reform and simplicity is the soul of these texts which introduces a new and different flavor in Urdu literature. This article attempts to mention some elements of this new literary aesthetics emerged from Ali Garh Tehreek.*

اردو تنقید میں جمالیات کا لفظ انگریزی Aesthetics کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر فلسفے ہی کا ایک پہلو ہے۔ بام گارٹن نے پہلی بار Aesthetics کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا۔ اس نے اس ضمن میں حواس اور ادراک کو اہمیت دیتے ہوئے اس کی تعبیر ایک الگ علم کے طور پر کی۔(۱) جمالیات کی تاریخ طویل اور تفصیل پیچیدہ ہے جس کے بیان کا یہ محل نہیں۔ سادہ لفظوں میں اس کا مفہوم حسن آفرینی کا ہے اور چونکہ تمام فنون اور خاص کر فنونِ لطیفہ کا بنیادی محرک ہی حسن آفرینی کا جذبہ ہے اس لیے یہ ہر فن کا لازمہ ہے۔ ہر زمانہ اپنے مخصوص سماجی اور ثقافتی تناظر میں حسن کے معیارات مقرر کرتا ہے جو تناظر کے تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کسی عہد کے ادب کی عمومی پرکھ سہ جہتی عمل ہے:

۱۔ ادب کی مرکزی فکری نہج

۲ ۔ اصنافِ ادب میں ترجیحات

۳۔ نمائندہ ادب کی لسانی و اسلوبیاتی انفرادیت

ہر زمانے کا ادب کسی فن پارے میں انھی جہات سے حصولِ کمالِ فن یا دوسرے لفظوں میں حسن آفرینی کی سعی کرتا ہے۔ اردو ادب کے کلاسیکی عہد میں جو قریباً تین صدیوں کو محیط ہے، مختلف ادوار اور مختلف ادبی مراکز میں کسی ایک یا دو جہات سے معیارات بدلتے رہے ہیں، یعنی کسی دور میں ادب کا فکری دھارا سیاسی و سماجی حالات اور دیگر وجوہات کے زیر اثر کسی طرف کو مڑ گیا، کسی دور میں کسی خاص

* استاد شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی، آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

صنف کو اس کی خصوصیات کی بنا پر دیگر اصناف پر ترجیح حاصل ہو گئی، یا کسی عہد کے نمائندہ تخلیق کاروں کے ہاں زبان و اسلوب کا کوئی نیا اجتماعی ذائقہ دریافت ہو گیا۔ تاہم انیسویں صدی کے وسط سے پہلے تک کسی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ ادب کی پرکھ کے ان تینوں جہات کے معیارات بیک وقت بدل گئے ہوں۔ اگرچہ اس ضمن میں تاریخ ادب کے ایک محدود پڑاؤ فورٹ ولیم کالج کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں پہلی بار ادب کا استعمال ایک خاص مقصد کے لیے کیا گیا، بطور صنف نثر کو شاعری پر ترجیح دی گئی، اردو نثر کے اسلوب کا اہم ترین سنگ میل "باغ و بہار" وجود میں آیا، اور زبان کے ضمن میں سہل نگاری کو اختیار کر کے اس کا دائرہ داستانوی ادب سے علمی ادب تک بڑھایا گیا۔ لیکن اس نکتے کو مضمون کے اختتام تک معرضِ التوا میں ڈالتے ہوئے اس بات کی طرف آتے ہیں کہ وسیع کینوس پر یہ اختصاص سرسید اور ان کی بپا کردہ تحریک کا ہے کہ جس نے ادب کی جمالیات کا پورا تصور ہی بدل کر رکھ دیا۔

یہ بات معروف ہے کہ سرسید اور ان کی تحریک بنیادی طور پر اصلاحی تحریک تھی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس اصلاح سے مراد معاشرتی اصلاح ہے جس کا مقصد غلامی کے عہد کے ہندوستان میں مسلمانوں، اور خاص کر طبقہ اشرافیہ کے سیاسی اور معاشرتی مقام کی ممکن حد تک بحالی ہے۔ اصلاح کے اس عمل میں تعلیم، ادب اور صحافت کو وسیلوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔ صحافت تو چونکہ ہندوستان کی حد تک نیا متعارف کرایا گیا شعبہ تھی، اس لیے اس میں اصلاح کا سوال نہیں، سو یہ ہر اعتبار سے خوش آئند اقدام تھا۔ تاہم تعلیم اور ادب کے اس 'سوچے سمجھے استعمال' کے فوری سیاسی و سماجی فوائد کے برحق ہونے کے باوجود اس کے مضمرات روزِ اوّل ہی سے موضوعِ بحث رہے ہیں اور یہ کہنے والے مفکرین بھی موجود ہیں کہ

> "سیاست ہو کہ تعلیم سرسید، باوجود دوراندیش ہونے کے، بیسویں صدی میں ہونے والی دور رس تبدیلیوں کا اندازہ نہ کر سکے۔ ان کی سیاسی فکر جمہوریت، قومیت اور اقلیت کے تضادوں کو دُور کرنے میں الجھ کر رہ گئی اور تعلیمی فکر انگریزی، اردو اور ہندی کے درمیان توازن نہ قائم کر سکنے کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ سلسلہ ان کے بعد تقسیم و آزادیِ ملک کے عمل تک قائم رہا بلکہ اس کے دھندلکے اب تک باقی ہیں۔"(۲)

سرسید کے افکار و اقدامات پر تنقید کرنے والے اہلِ یمین میں سے بھی ہیں اہلِ یسار میں سے بھی۔ اہلِ یمین کو سرسید کی مذہبی تعبیرات سے اور اہلِ یسار کو معاشرے کے پس ماندہ طبقوں کے مستقبل سے سرسید کی بے توجہی جیسے عوامل سے شکوہ رہا، تاہم تنقید و اختلاف کے باوجود شاذ ہی کسی ناقد نے سرسید کے اخلاص پر شبہ کیا ہو۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ اس دور کی سیاسی و سماجی صورت حال میں مسلمانوں کے سامنے ایک قوم کے طور پر جہد البقا کی اس سے بہتر کوئی صورت بھی ممکن تھی کہ نہیں لیکن موجودہ گفتگو میں یہ زیر بحث نہیں۔ اس مختصر تجزیے کا دائرہ محض اتنا ہے کہ جو صورت اختیار کی گئی اس کے ادبی مضمرات کیا رہے۔

فکری نہج کے اعتبار سے دیکھیں تو اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار تحریک کی صورت میں شعوری طور پر ادب کو ایک مقصد کے تابع کیا گیا۔ سیاسی اور سماجی اصلاح کا یہ عمل افکار، نظریات اور روایات کی تشریح و تعبیر میں توسیعی کی بجائے انقلابی تھا۔ روایت کی تقلید سے منہ موڑ کر اور آزادہ فکری کی روش اپنا کر سرسید نے ایک ایسا مکتبِ فکر متعارف کرایا جس کی زمام عقل کے ہاتھ میں، جس کی فضا نیچری،

جس کا رویہ تہذیبی اور جس کا مقصد مادی ترقی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہاں نیچر اور تہذیب کے معنی مخصوص ہیں جن کی تشریح و تعبیر سرسید اور ان کے حلقے کے دیگر مفکرین کے ہاں ملتی ہے۔ اس فکری نہج کے پروردہ ذہن کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> "سرسید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا اس کے عناصر ترکیبی کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے بڑے بڑے عنوان ہوں گے مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری۔ سرسید کے مجموعی فکر و ادب کی عمارت انھی بنیادوں پر قائم ہے اور شاید یہی وہ نمایاں اور اہم رجحانات ہیں جو اردو ادبیات میں سرسید کا فیض سمجھے جاسکتے ہیں۔"(۳)

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس ذہن کی تشکیل ہنگامی حالات میں ہوئی ہے، سو اس میں خرابی کی ایک صورت مضمر رہی۔ سید عبداللہ ہی نے اس کی نشاندہی بھی کی ہے اور کہا ہے کہ سرسید "ایک خاص تہذیب اور اجتماع کی ایک ایسی صورت اور نظام کے قائل ہیں جس میں ہمواری، نظم، سلیقہ، توازن، ترتیب اور اعتدال ہو مگر یہ ساری تہذیب کسی قدرتی ارتقا سے وجود میں آئی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ ساختہ پرداختہ اور آوردہ معلوم ہوتی ہے جس کے خارجی اور مستعار عناصر ملکی اور قومی مزاج میں اچھی طرح جذب نہیں ہوئے۔"(۴)

اس تناظر میں دیکھیں تو سرسید کی مذہبی تعبیرات ہوں، نذیر احمد کی ناول نگاری ہو، حالی کی تنقید نگاری ہو یا آزاد کی جدید نظم، ان سب کے مقاصد علمی و ادبی کم اور سیاست سے زیادہ علاقہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس میں کارنامے کا پہلو یہ ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں تحریکی انداز میں اس فکری نہج کی ترویج سے، مخالفین کی مسلسل زورآزمائی کے باوجود، اردو ادب کے قارئین کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہوئی جو اس بدلی ہوئی فکری روش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی۔

دوسری جہت یعنی اصنافِ ادب کی ترجیحات کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس تحریک میں مجموعی طور پر نثر کو شاعری پر ترجیح حاصل رہی۔ سرسید نے اپنی پیش رو اردو شاعری پر سخت گرفت کی ہے۔ ان کے بقول:

> "فن شاعری جیسا ہمارے زمانہ میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔"(۵)

اعتراضات کا یہ سلسلہ اور دائرہ محض موضوعات تک محدود نہیں، سرسید کو شاعری کے طریقہ کار پر بھی اعتراض ہے۔ "تہذیب الاخلاق" (۱۱مارچ 1872ء) میں لکھتے ہیں:

> "خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دِل میں یا خصلت میں یا اس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے، کچھ بھی نہیں ہوتا۔"(۶)

انجمن پنجاب میں آزاد کا خطبہ اور حالی کا مقدمہ دونوں اسی نظریے کی تفسیریں ہیں۔ شاعری سے سرسید کی اس درجہ برگشتگی کی وجوہات دو ہی نظر آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ انیسویں صدی سے پہلے کے اردو ادب میں نثر مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے نہ ہونے کے برابر ہے اور ادبی اظہار کا پیرایہ عموماً شاعری ہی ہے، سو شاعری پر تنقید کا بالواسطہ مطلب ادبی روش پر تنقید ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی حد تک پروپیگنڈے کی سطح کو پہنچتا ہوا جس نوع کا ادب سرسید کی تحریک کو درکار تھا، شاعری کا پیرایہ اس کے لیے زیادہ موزوں نہ تھا۔ مزید برآں علمی اور سائنسی افکار بھی نثر ہی میں بیان ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب پر سرسید کے احسانات کا تذکرہ کرنے والوں نے جب ادب کہا ہے تو اس سے مراد عموماً نثر ہی ہے۔ یہ سلسلہ شبلی سے شروع ہوتا ہے جو کہتے ہیں:

> "سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں، اگرچہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت اور جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کی استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔" (۷)

بعد ازاں رام بابو سکسینہ اور اردو ادب کے بیشتر مؤرخین نے شبلی کی اسی بات کو آگے بڑھایا ہے اور ادب سے مراد نثر ہی لیا ہے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ آتی ہے کہ اس کا مطمحِ نظر رمز و ایما اور علامت و اشاریت سے گریز ہے۔ اس مؤقف کو مزید تقویت اس حقیقت سے حاصل ہوتی ہے کہ نثر میں بھی انھی اصناف کو رواج دیا گیا جن میں افسانویت یا فینٹاسی کے عناصر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے اردو نثر کو نئے شعبوں اور نئے ابعاد سے روشناس کرایا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو سرسید کی خدمات کا بڑا دائرہ علمی اور صحافتی نثر کا ہے۔ یوں واضح ہو جاتا ہے کہ سرسید کے ہاں ادب سے مراد وہی ہے جو انگریزی میں لٹریچر کے لفظ سے ہے اور جو محض ادبی تحریروں تک محدود نہیں بلکہ ہر لکھی ہوئی چیز لٹریچر ہے۔ اردو ادب کو، ادب کا یہ تصور بھی سرسید ہی کی عطا سمجھی جا سکتی ہے، اگرچہ اس رویے نے اردو قاری کو اپنے کلاسیکی ادب کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا کیا جس کی گونج بیسویں صدی میں کلیم الدین احمد جیسے ناقدین تک سنائی دیتی ہے۔

لسانی و اسلوبیاتی جہت سے دیکھا جائے تو علی گڑھ تحریک بہت ثروت مند نظر آتی ہے۔ سرسید کے رفقا نے علمی اور صحافتی نثر کے ساتھ ساتھ تخلیقی نثر کے بھی ایسے اعلیٰ نمونے پیش کر دیے ہیں جن سے اردو کے ابلاغی دائرے گوناگوں ہو گئے ہیں۔ بعض لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سرسید کی بدولت اردو زبان اس قابل ہوئی کہ محل سراؤں سے نکل کر عوام سے آنکھیں ملا سکے۔ اگر یہ درست ہے تو وہ زبان کونسی تھی جو اٹھارویں صدی میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی تھی اور میر اس میں شعر کہتے تھے۔ اور خود سرسید احمد خان تو

اردو کے آغاز کی وجہ ہی عوامی میل جول بتاتے ہیں۔ دراصل سرسید کو اردو سے بطور زبان کم اور اس کی مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی تشخص کی علامت کی حیثیت سے زیادہ دلچسپی تھی ورنہ مسعود حسین خان کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ "یہ دلچسپ تضاد ہے کہ سرسید اردو کے محاذ پر آخر وقت تک ڈٹے رہے لیکن کالج کیمپس میں اس زبان کے لیے وہ کوئی پُر وقار مقام نہ پیدا کر سکے۔"(۸)

اسلوب کے حوالے سے بات کی جائے تو شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد اور خود سرسید نہایت مستحکم طور پر اپنی انفرادیت کا نقش جماتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح کلاسیکی نثر کے اسلوب کو بھی سرسید طنزِ ملیح کی زد پر ہی رکھتے ہیں، خواہ سادہ بیانی کی وہ روش جس پر آگے چل کر خود اس تحریک نے اپنا قصرِ عالی شان کھڑا کیا، اس کی بنیادیں اسی اسلوب پر استوار ہوں۔ سرسید لکھتے ہیں :

> "نئی اردو نے در حقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر و درد و ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو، کی ہو۔ میر امّن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو، کہہ دی ہو جو اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہو گی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کو سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔"(۹)

بات ختم کرنے سے پیشتر ملتوی کیے گئے اس نکتے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ذکر فورٹ ولیم کالج کا تھا۔ آج دو سو برس سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے تحت اردو نثر کی اسلوبیاتی ترقی اپنی جگہ لیکن اس ادارے نے ہندوستان پر انگریزی راج کو مستحکم کرنے، لسانی سطح پر اردو ہندی تنازع پیدا کرنے، انگریزی زبان و ادب کو مقامی زبانوں کی تعلیم و ادب پر ترجیح دے کر بالعموم اہلِ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں پر غلامی کی حجت تمام کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس کی کوئی اتفاقیہ یا غیر اتفاقیہ مماثلت سرسید تحریک سے نکلتی ہے؟

مجموعی طور پر سرسید تحریک میں ادب کو حدیثِ دل اور باطنی احساسات کے نقیب کے بجائے سماجی خدمت گار کی ذمہ داری تفویض ہوئی، مابعد الطبیعیاتی عنصر کی جگہ ارضی عناصر پسندیدہ قرار پائے، عربی فارسی کی علمی روایت سے استفادہ کرتی ہوئی زبان کے بجائے سادہ بیانی پسندیدہ ٹھہری، ماورائیت اور تخیل اساس اصناف کی بجائے راست اظہار پر مبنی اصناف کو قبولیت ملی۔ ادبی جمالیات کا یہ انقلاب صاف طور پر بتاتا ہے کہ

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

اور اس کی وجہ بھی وہی ہے جو دوسرے مصرعے میں بیان ہوئی

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

لیکن مسلمانانِ ہند ضمیروں میں ابھرنے والی اس تبدیلی کو قبول کرنے میں تامل کا شکار تھے جو اگرچہ تلخ تھی لیکن بہر حال حقیقت تھی۔ سرسید تحریک نے مسلمانانِ ہند کو قدیم و جدید کی ذہنی کشمکش سے نکالا۔ مجموعی طور پر یہ مغربی تہذیب اور اس سے وابستہ افکار

کو اردو میں رائج کرنے کی سعی تھی جس نے قدیم تہذیب کے آثار و مظاہر سے بے زاری اور نئی تہذیب کے اجنبی مظاہر کو گوارا بنانے کا عمل سرانجام دے کر مسلمانانِ برصغیر کو اپنی شکست اور محکومی کو تسلیم کرنے اور اس سے آگے کا سوچنے پر آمادہ کیا۔

حوالہ جات:

۱۔ نصیر احمد ناصر، تاریخ جمالیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول 1962ء، ص13

۲۔ مسعود حسین خان، سرسید اور اردو یونیورسٹی (پانچواں سرسید یاد گاری خطبہ)، مرتبہ: خواجہ محمد شاہد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1993ء، ص24

۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1994ء، ص، 251

۴۔ ایضاً، ص253

۵۔ سرسید احمد خان، مقالات سرسید، جلد دوم، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1962ء، ص47

۶۔ سرسید احمد خان، مقالات سرسید، جلد دہم، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1963ء، ص47

۷۔ شبلی نعمانی، مولانا، مقالات شبلی، جلد دوم، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ، 1931ء، ص57

۸۔ مسعود حسین خان، سرسید اور اردو یونیورسٹی (پانچواں سرسید یاد گاری خطبہ)، مرتبہ: خواجہ محمد شاہد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1993ء، ص24

۹۔ سرسید احمد خان، مقالات سرسید، جلد دہم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص 115

☆☆☆☆☆